محمد جعفر پھلواروی

ضبطِ ولادت

اس سے پہلے دو مضامین ضبطِ ولادت کے متعلق شائع ہو چکے ہیں۔ ایک تو ماہ اپریل ۵۷ء کے ثقافت میں جناب ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم صاحب کا مقالہ تھا جو فیملی پلاننگ بورڈ کے عظیم الشان جلسے میں پڑھا گیا۔ دوسرا مضمون الشیخ الخولی کا ہے جس کا ترجمہ ماہ مئی ۶۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اب تیسرا مضمون ملاحظہ فرمائیے۔ یہ مسئلہ آج اس لئے حل طلب ہو گیا ہے کہ یہ تنہا پاکستان کا مسئلہ نہیں بلکہ پورے کرۂ ارض کا مسئلہ ہے۔ پاکستان کی آبادی میں دس لاکھ سالانہ کا اضافہ ہو رہا ہے یعنی تقریباً تین ہزار روزانہ۔ اور امریکہ کی جدید ایک رپورٹ کے مطابق دنیا کی آبادی ۲ ارب ۷۰ کروڑ ہے، جس میں ۴ کروڑ ۳۸ لاکھ سالانہ کے حساب سے اضافہ ہو رہا ہے۔

ضبطِ ولادت پر گفتگو کرتے وقت دو اہم سوال سامنے آجاتے ہیں:

(۱) ضبطِ ولادت قتلِ اولاد ہے یا نہیں؟

(۲) قتلِ اولاد کسی شکل میں اب بھی ہم کر رہے ہیں یا نہیں؟

پہلے سوال کو حل کرنے کے لئے دو باتوں پر غور کرنا چاہیئے:

(ا) ضبطِ ولادت کے کیا کیا طریقے ہیں؟

(ب) اس کی ضرورت کیا ہے؟

جہاں تک طریقوں کا سوال ہے اس کے چار ہی شیخ سمجھ میں آتے ہیں: ایک یہ کہ وظیفۂ ازدواج ادا ہی نہ کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ یہ وظیفہ تو ادا کیا جائے لیکن بعض ادویہ یا "جلود فرنشی" یا عزل وغیرہ کی مدد سے مواقع استقرار کو ختم کر دیا جائے۔ تیسرے یہ کہ بعد از استقرار کسی طریقے سے اسے ساقط کر دیا جائے۔ چوتھے یہ کہ بعد از ولادت اسے ختم کر دیا جائے۔

پہلا طریقہ کم از کم اہلِ شباب کے لئے تکلیف مالا یطاق ہونے کے علاوہ اپنے اندر فراریت رکھتا ہے۔ اس لئے یہ خارج از بحث ہے۔ دوسرے طریقے کو بھی قتلِ اولاد قرار دینا مشکل ہے۔ لیکن یہ فعل خود حاملہ کے بیئے اس قدر باعثِ کرب و تکلیف اور مضرِ صحت ہے کہ قتلِ جنین کے علاوہ خود قتلِ مادر کی سرحد سے بھی قریب تر ہو جاتا ہے۔ ...... اس لئے اس کی اجازت بھی نہیں دی جا سکتی۔ رہا چوتھا طریقہ تو یہ بلاشبہ قتلِ نفس، قتلِ اولاد اور بدترین وحشت و درندگی ہے اور اس کی اجازت کا سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اس کا شمار ضبطِ ولادت میں ہے ہی نہیں۔ ضبطِ ولادت تو

ہوتا ہی ہے ولادت سے پہلے۔ اور ولادت کے بعد اس کی نوعیت ہی بدل جاتی ہے اور اب وہ ضبطِ ولادت کی سرحد سے باہر آکر قتلِ نفس بن جاتا ہے۔

غرض ضبطِ ولادت کے ان چار طریقوں میں چوتھا تو ضبطِ ولادت میں داخل ہی نہیں۔ رہے تین طریقے، تو ان میں پہلے اور تیسرے طریقے کو بھی خارج از بحث سمجھنا چاہئے۔ صرف دوسرا ہی طریقہ قابلِ غور ہو سکتا ہے۔ جہاں تک ہم غور کر سکے ہیں وہ یہ ہے کہ اسے لا تقتلوا اولادکم کے حکم میں داخل کرنا ایک کھینچ تان سے زیادہ نہیں بوجوہ ذیل:

(الف) مادۂ تولید کے ایک دفق وجست میں اتنے جرثومۂ حیات ہوتے ہیں کہ وہ پورے کرۂ ارض کی عورتوں کو اولاد بخشنے کے لئے کافی ہیں لیکن قدرت کا ضبطِ تولید دیکھئے کہ وہ اربوں جراثیم حیات میں کسی ایک جرثومے کو روح انسانی بننے کے لئے منتخب کر لیتی ہے اور باقی تمام جواہر زندگی کو ضائع کر دیتی ہے اور پھر ایک بار ہی ایسا نہیں ہوتا بلکہ ہر انسان کے ساتھ ہزاروں بار ایسا ہی ہوتا ہے اور بعض اوقات تمام عمر یہ کھربوں جواہر حیات رائیگاں جاتے رہتے ہیں اور کوئی اولاد نہیں ہوتی۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اپنی کوشش سے تمام جراثیم زندگی کو مار دینا "تخلق باخلاق اللہ" کا کوئی اعلیٰ نمونہ ہے۔ لیکن یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ جب ہمیں یہ پوری طرح علم ہے کہ ان اربوں جراثیم حیات میں صرف ایک ہی جرثومہ اولاد بن سکے گا، اور پھر بھی، یہ دعوےٰ نہیں کیا جا سکتا کہ ضرور بنے گا تو کیا ان بیشمار جراثیم کی اضاعت قتلِ اولاد میں شمار ہوگی؟

(ب) یہ شکل تو خیر ایسی ہے جس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان اپنے محدود علم کی وجہ سے بار بار تولید کی سعی کرتا ہے اور اس سلسلے میں جو کچھ بھی اضاعتِ جواہر ہوتی ہے وہ اپنے بس سے باہر ہے، لیکن اس صورت میں جبکہ استقرارِ حمل کا یقینی علم حاصل ہو چکا ہو وظیفۂ زوجیت قطعاً حرام ہونا چاہئے اس لئے کہ اس کے بعد یہ یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اب جو کچھ بھی جوہرِ تولید باہر لایا جائے گا وہ بہرحال رائیگاں جائے گا اور اربوں نفوس کے قتل پر منتج ہوگا۔ عقیمہ (بانجھ) کا معاملہ بھی اسی سے ملتا جلتا ہے۔

(ج) اگر کوئی شخص کسی ایک دانۂ غلہ ضائع کر دے تو اس پر ایک دانے کی اضاعت سے زیادہ کوئی الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تو نے ہمارا کھیت ضائع کر دیا کیونکہ فیصلہ ہمیشہ موجودہ صورتِ حال پر ہوگا نہ کہ آئندہ کی متوقع شکل پر۔ ایک دانہ کھا جانے والے کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تم کھیت کا کھیت نگل گئے۔ اسی طرح اگر اربوں جراثیم حیات ___ جو یقیناً ضائع ہی ہونے والے ہیں ___ کے ساتھ اگر صرف ایک آدھ جرثومہ ___ جو نہ متعین ہے اور نہ اس کے متعلق نفسِ انسانی بننے کی کوئی یقینی توقع ___ بھی ضائع کر دیا جائے تو اسے کسی طرح بھی قتلِ نفس میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔

(د) دنیا میں کہیں ایسے والدین نہیں دیکھے گئے جو ہر روز ان اربوں جراثیم کے ضائع جانے پر ایک دن کی اولاد کی طرح بھی ماتم و غم کرتے ہوں، ان کی تجہیز و تکفین کرتے ہوں یا ان کی نماز جنازہ ادا کرتے ہوں اور ان کے

اقربہ تعزیت کے لئے آتے ہوں۔ پھر ان کی اضاعت کو قتلِ نفس یا قتلِ اولاد کے ادنیٰ ترین درجے میں بھی کس طرح رکھا جاسکتا ہے؟ اس طرح کی اضاعت تو آئے دن بدخوابی میں بھی ہوتی رہتی ہے۔ اگرچہ اس میں اپنا اختیار نہیں ہوتا لیکن اسے انسانی آبادی کی ہلاکت کب سمجھا جاتا ہے؟

(۷) پھر ان انبیاء و اولیاء کے متعلق کیا کہا جائے گا جنہوں نے تجرد کی زندگی گزار کر اربوں کی انسانی آبادی کو باہر آنے سے روک رکھا؟

(۸) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے عزل کا مسئلہ درپیش ہوا لیکن حضورؐ نے نہ اسے قتلِ نفس قرار دیا اور نہ قتل النفس بالنفس کو اس کی حد بتایا۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ:

کنا نعزل علی عھد النبی صلی اللہ علیہ وسلم والقرآن ینزل۔ (بخاری)

ہم لوگ عہدِ نبوت میں عزل کرتے رہے اور نزول قرآن کا سلسلہ جاری تھا (یعنی اگر یہ حرام ہوتا تو قرآن یقیناً اسے صاف لفظوں میں روک دیتا)

دوسری روایت حضرت ابوسعیدؓ سے ہے کہ:

کنا نعزل فسئلنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال او انکم لتفعلون؟ قالھا ثلثا ما من نسمۃ کائنۃ الی یوم القیمۃ الا ھی کائنۃ۔ (بخاری)

یعنی ہم لوگ عزل کیا کرتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں دریافت کیا حضورؐ نے تین بار پوچھا کہ کیا واقعی تم لوگ ایسا کرتے ہو؟ پھر فرمایا کہ جو روح پیدا ہونے والی ہے وہ تو پیدا ہو کر رہے گی اور تاقیامت یہی ہوتا رہے گا۔

حضورؐ نے عزل کو منع نہیں فرمایا، کچھ ناپسندیدگی کا شائبہ پیدا ہوتا ہے۔

غرض اس طرح کے ضبطِ ولادت کو کسی دلیل سے بھی قتلِ اولاد یا انسانی آبادی کی ہلاکت کا نام نہیں دیا جاسکتا ہاں سوال صرف یہ ہوسکتا ہے کہ آخر اس نوع کا ضبطِ تولید کیوں کیا جائے اور اس کی کیا ضرورت ہے؟ یہی ہے سوال نمبر II۔ اس لئے ذرا اس پر بھی ایک سرسری نظر ڈالتے چلیں:

ضبطِ تولید کی غرض و غایت دو ہی سمجھ میں آتی ہیں:

ایک جذبۂ تعیش اور

دوسری خوفِ محتاجی (خشیۃ املاق)

جذبۂ تعیش سے مراد یہ ہے کہ بعض زن و مرد صرف اس لئے ضبطِ تولید کی فکریں کرتے ہیں کہ ایک معصوم کے وجود کو یعنی اس کے رونے دھونے کو اس کی خدمت کو اس کی صبر آزما پرورش اور تربیت کو اپنے موجودہ عیش و سکون میں مخل

سمجھتے ہیں۔ ان کے اندر وہی نفسیاتی فراریت اور خود غرضی ہوتی ہے۔ یہ جذبہ یہاں تک ترقی کر جاتا ہے کہ اگر بدقسمتی سے کوئی بچہ ہو جائے تو اس کی بھوک اور رونے پر اس کے بار بار کے بول و براز پر اور اس کی بیماری پر ہر وقت ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ بظاہر کچھ نہ بولیں مگر اندر سے یہ تمنا کرتے ہیں کہ یہ کمبخت مر جائے تو اچھا ہے، اس جھنجھٹ سے نجات ملے۔ اور وہ مر جائے تو ظاہر میں دوسروں کے سامنے مغموم ہونگے لیکن اندر سے خوش ہونگے کہ اس مصیبت سے نجات ملی۔ اس بچے کو نہیں بلکہ ہیں۔ اس قسم کے جذبات میں غیر ہمدردانہ خود غرضی، بے صبرانہ فراریت، مقابلۂ امتحان سے گریز، آدم بیزاری اور معاشرہ کش شقاوت پائی جاتی ہے اور قانونِ اخلاق و عقل اس غرض کے لئے ضبطِ ولادت کی اجازت نہیں دے سکتا۔

رہی دوسری غرض تو اس پر بڑی سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے۔ یہ ہم ابھی عرض کر چکے ہیں کہ اس قسم کا ضبطِ ولادت قتلِ اولاد کے ضمن میں نہیں آتا جو محض جرثومۂ حیات کی اضاعت کی شکل رکھتا ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک فعلِ عبث ہے اور اگر غرض درست نہ ہو (مثلاً محض تعیش مقصود ہو)، تو اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ آیا اس طرح کے ضبطِ تولید میں کوئی صحیح مقصد بھی ہو سکتا ہے یا نہیں؟ یہاں آ کر ہمیں "خشیۃ املاق" (اندیشۂ محتاجی) پر غور کرنا پڑتا ہے اور اس کے علاوہ کچھ دوسرے عوامل پر بھی۔ محتاجی کے خوف سے ایسا ضبطِ تولید بھی اُس ضبطِ تولید سے زیادہ مختلف نہیں معلوم ہوتا جو محض تعیش کے لئے ہو۔ اس میں بھی ایک طرح کی خود اعتمادی کی کمی، پست ہمتی، مقابلۂ ابتلاء سے گریز، جد و جہد سے فرار، مایوسی و پسپائی وغیرہ پائی جاتی ہے۔ انسانی کیریکٹر کی یہ کمزوری بھی کسی وقت اسقاط یا قتلِ اولاد تک لے جا سکتی ہے بعض عربوں میں یہ اخلاقی کمزوری موجود تھی اسی لئے لا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق فرمایا گیا۔ لیکن محتاجی کے خوف سے قتلِ اولاد کی ممانعت کی گئی ہے۔ جرثومۂ حیات کی اضاعت اس حکم میں داخل نہیں جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے یہ محض ضبطِ [illegible] ہے قتلِ اولاد نہیں۔ ایسے ضبطِ تولید میں پست ہمتی و فراریت وغیرہ کا شائبہ تو ضرور پایا جاتا ہے لیکن اگر خوفِ محتاجی اس حد کا ہو جو ان شائبوں پر غالب آ جائے تو اس کی نوعیت اس ضبطِ تولید سے مختلف ہو جاتی ہے جو محض تعیش کے لئے ہو۔ اہلِ تعیش تو اس وقت بھی ضبطِ ولادت پر عمل کرتے ہیں جبکہ وہ فارغ البال ہوتے ہیں اور چند افراد کا اضافہ ان کی روزی چھیننے کا سبب نہیں بنتا۔ لیکن جب ایک غریب میاں بیوی اپنا پیٹ بھی مشکل سے پال رہے ہوں، تعیش کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا ہو اور عالمِ اسباب کو دیکھتے ہوئے مستقبل قریب میں کسی فارغ البالی کی توقع بھی نہ ہو تو اپنے عیش میں خلل ہونے کے خوف سے نہیں بلکہ — اپنی مصیبتوں میں کسی ذی روح کو شریک نہ کرنے کی نیتِ خیر رکھ کر اگر وہ ضبطِ تولید کریں — جو قتلِ اولاد نہیں صرف اضاعتِ جرثومہ ہے — تو اس میں قباحت و کراہت کا وزن بہت کم رہ جاتا ہے اور اس لحاظ سے اس نوع کے ضبطِ تولید کو ایک ایسی چیز سمجھنا چاہیئے جس کی قدریں حالات و مقتضیات کے تفاوت سے بدلتی رہتی ہیں۔ ایک وقت ایسا ہو سکتا ہے جبکہ انسانی آبادی کو بڑھانے کی ضرورت ہو مثلاً جگہ وسیع اور آبادی بہت کم ہو وسائلِ رزق فراواں ہوں۔ قوم کو عسکری قوت کی ضرورت ہو۔ . . . .

۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اضافۂ آبادی سے وسائلِ رزق کے غیر متوازن ہونے کا اندیشہ نہ ہو بلکہ آبادی کی تعلیم و تربیت اور امن و حفظ کا بھی پورا بند و بست ہو وغیرہ وغیرہ ـــــ تو ان حالات میں ضبطِ تولید عبث بلکہ مضر ہے اور سوسائٹی یا حکومت کا فرض ہے کہ وہ اسے روک دے۔ برعکس اس کے اگر انسانی آبادی پہلے ہی بہت زیادہ ہو۔ معاشرے کی خرابی سے عوام پر روزی تنگ ہو گئی ہو اور مزید آبادی سے وسائل رزق کے اور زیادہ غیر متوازن ہو جانے کا یقین ہو تعلیم و تربیت اور حفظ و امن کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہ ہو تو جو لوگ ان حالات سے متاثر ہوتے ہوں ان کے لئے اس دور کے ختم ہونے تک ضبطِ تولید کوئی عبث فعل نہیں۔ کیا ضرورت ہے کہ ایسی حالت میں انسانی آبادی کو خواہ مخواہ بڑھایا جائے اور انھیں نئی نئی مصیبتوں کا شکار بنا کر اپنی مصیبتوں میں بھی نئے نئے اضافے کئے جائیں؟ یہ کونسی نیکی ہوگی کہ اُمت میں اضافہ کرنے کا ثواب حاصل کرنے کی نیت سے اولاد تو پیدا کر لی جائے مگر وہ فاقوں میں زندگی بسر کرے، اپنے اخلاق کو برباد کرتی پھرے، دوسرے کے آگے دستِ سوال دراز کرتی رہے اور دین و قوم دونوں کی رسوائی کا سبب بنے یا جنگ و وبا کا شکار ہو۔

آج دنیا میں (عالمی مردم شماری رپورٹ کے مطابق) ہر روز ہزار ہا نفوس کا اضافہ ہو رہا ہے۔ اضافۂ آبادی کی اس رفتار سے ایک دو صدی کے بعد دنیا میں صرف کھڑے ہونے کے لئے جگہ رہ جائے گی۔ اور غذائی و تعلیمی حالت کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا ہوگا۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ آبادی زیادہ ہونے کے بعد قدرت خود توازن پیدا کر لیتی ہے یعنی یا تو جنگ ان سب کو ختم کر دیتی ہے یا کوئی وبا لیکن قدرت کو خواہ مخواہ یہ توازن پیدا کرنے کا موقع بہم پہنچانا کون سی نیکی ہے؟ انسانوں کو پیدا کر کے ان مصائب سے ختم کرانا زیادہ بہتر ہے یا اس سے پہلے ہی جراثیمِ حیات کو ضائع کر دینا؟ بہتر تو بہر حال یہی ہے کہ ان حالات میں بھی اس جوہرِ حیات کو باہر ضائع کرنے کی بجائے اپنے اندر ہی محفوظ رکھا جائے اور جو ایسا کر سکتا ہو اسے یہی کرنا چاہئے لیکن جس کے بس میں یہ نہ ہو یا کسی اور غیر ارادی طور پر ضائع ہو جانے کا خدشہ ہو اس کے لئے مباح طریقے کی اضاعت ایسی مخلوق پیدا کرنے سے بہتر ہے جو اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی ہزار لا ینحل الجھنوں کا سبب ہو۔

جذباتی اور خوش اعتقادانہ تصورات تو یہی ہوتے ہیں کہ ۔۔۔ "تقدیر بھی ایک حقیقت ہے جو آتا ہے اپنی روزی ساتھ لاتا ہے، توکل علی اللہ اصل ایمان ہے، اسباب کی بجائے مسبب الاسباب پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔ اور آنے والی روح تو بہر حال آ کر رہتی ہے" وغیرہ وغیرہ۔ اپنی جگہ یہ ساری باتیں درست ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ "بر توکل زانوئے اشتر ببند" (ترجمۂ حدیث) اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ لیس للانسان الا ما سعیٰ (۵۳ : ۳۹) اگر کوئی شخص وظیفۂ زوجیت ادا نہ کرتا ہو اور دعا یہ کرے کہ "اے اللہ! مجھے ایک صالح اولاد دے" تو اس کا یہ توکل علی اللہ محرومی کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں پیدا کر سکتا۔ سچ کہا ہے حضرت میاں میرؒ (لاہور) نے کہ: "ترکِ اسباب مسبب الاسباب

کے ساتھ استہزا کرنا ہے۔ دنیا کے کسی انفرادی اور اجتماعی کام میں بھی صرف تقدیر پر اعتماد نہیں کیا جاتا تدبیر بھی ساتھ ساتھ ہوتی ہے لیکن انسانی آبادی کے غیر ضروری اضافے کے وقت صرف تقدیر سامنے ہوتی ہے۔ انسان کو نباتات و جمادات کی طرح تقدیر کا پابند نہیں بنایا گیا ہے۔ اس کا منصب اپنی تقدیر کو آپ بنانا بھی ہے اور اسے عقل و بصیرت اسی لئے دی گئی ہے کہ تقدیرات سے مسلسل جنگ کر کے آگے بڑھتا رہے۔ اور اسفل مخلوقات کی طرح پابند ہو کر نہ رہ جائے بلکہ تقدیرات کو اپنا پابند کرنے کے لئے پیہم ارتقا کرتا رہے۔

محض تقدیر پر بھروسہ کر کے تو (بموقعۂ جنگ) نماز بھی نہیں ادا کی جاتی۔ وہاں بھی مجاہدین کے دو حصے ہو جاتے ہیں جن میں ایک لڑتا ہے اور دوسرا نماز ادا کرتا ہے پھر وہ نماز ادا کرتا ہے اور یہ لڑتا ہے۔ اس طرح نماز صرف ایک ہی رکعت ادا کی جاتی ہے۔ یہ ہے تدبیر جو حالات بدل جانے سے نماز میں تخفیف اور شکلِ ادا میں تبدیلی پیدا کر دیتی ہے۔ پس اگر ملکی یا عالمی حالات روزی، تربیت اور آبادی کے تناسب و توازن میں بگاڑ پیدا کر رہے ہوں تو ضبطِ تولید سے توکّل علی اللہ میں کون سا فرق پیدا ہو جائے گا؟ یہ تو محض ایک احتیاطی تدبیر ہے جس کا تقدیر سے کوئی ٹکراؤ نہیں۔

ضبطِ تولید کے متعلق ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ بس آج ہی سے یہ مشغلہ شروع کر دیا جائے۔ ہم نے تو صرف یہ بتایا ہے کہ ایسے حالات بھی ہو سکتے ہیں جبکہ ضبطِ تولید کی کراہیت اباحت سے بلکہ کسی وقت وجوب سے بدل جائے۔ رہا یہ کہ ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں؟ تو اس کا فیصلہ ہمارا کام نہیں، ارباب حل و عقد کا کام ہے۔ جن کو اس کے بہت سے دوسرے گوشوں کو بھی دیکھنا پڑے گا۔ مثلاً:

(۱) کیا واقعی ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ ضبطِ ولادت پر عمل کرانا ضروری ہے؟

(۲) کیا ضروریاتِ زندگی (جس میں غذائیات، لباس، مکان، تعلیم، تربیت، معالجہ وغیرہ سب داخل ہیں) اور آبادی کے بگڑے ہوئے توازن پر قابو پانے کا کوئی اور متبادل طریقہ بھی نکالا جا سکتا ہے؟

(۳) کیا صرف ایک ہی مملکت میں ضبطِ ولادت پر عمل کرنے سے خاطر خواہ مقصد حاصل ہو جائے گا یا اسے عالمی تحریک بننے تک ملتوی رکھنا چاہئے؟

(۴) کہیں ایسا تو نہیں کہ ضروریات و آبادی کا یہ عدم توازن نظامِ اجتماعی کی کسی اور بنیادی خرابی کی وجہ سے ہو جسے دور کرنے کے بعد ضبطِ ولادت کی ضرورت ہی باقی نہ رہے؟

(۵) اور سب سے زیادہ اہم اور بنیادی سوال یہ ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ضبطِ ولادت کی تدبیروں کو غلط محل پر استعمال کیا جانے لگے، ناجائز ولادت کا تو علم ہو جاتا ہے، لیکن ناجائز تعلقات کی بقا کے لئے ضبطِ ولادت اور زیادہ معین ثابت ہوگا۔

(۶) پھر یہ بھی دیکھنا ضروری ہوگا کہ واقعی ضرورت کے وقت ضبطِ تولید میں اعتدال سے تجاوز نہ ہو ورنہ آبادی

کی کمی سے بھی اُسی وزن کی دوسری خرابیاں پیدا ہوسکتی ہیں جو آبادی کی زیادتی سے واقع ہوتی ہیں۔

غرض ان تمام کوششوں پر اچھی طرح غور و فکر کے بعد ہی کسی دَور کے ارباب حل وعقل فیصلہ کرسکتے ہیں کہ اس وقت ضبطِ ولادت کے طریقے استعمال میں لانے چاہئیں یا نہیں۔

یہ معلوم کرنے کے بعد کہ ضبطِ ولادت قتلِ اولاد میں داخل نہیں اور بوقتِ ضرورت اس سے کام لیا جاسکتا ہے۔ ایک دوسرا سوال سامنے آتا ہے۔ ضبطِ ولادت کے مسئلے سے اس کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ سوال یہ تھا کہ اب بھی ہم لوگ کسی شکل میں قتلِ اولاد کے مرتکب ہو رہے ہیں یا نہیں؟ اگر آپ غور سے دیکھیں گے تو یہ نظر آئے گا کہ ؎

بدل کے بھیس یہ آتے ہیں ہر زمانے میں　　اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

جس طرح جذبۂ بُت پرستی نے اب پتھر کی مورتیوں کی بجائے وطنیت، نسلیّت وغیرہ کا روپ دھار لیا ہے — ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے — اسی طرح اب قتلِ اولاد نے بھی گلا گھونٹنے یا زندہ درگور کرنے کی ایک دوسری شکل اختیار کر لی ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنی اولادِ اناث کو علوم و فنون سے محروم اور جاہل رکھنا تعمیرِ زندگی میں انھیں مکھن کے بال کی طرح الگ نکال پھینکنا، انہیں صرف تولید کے لئے وقف رکھنا اور علمی، فنی، ذہنی غرض تمام حیاتی ترقیوں سے بے بہرہ کرکے بے جان اور بے بس بنا دینا اور ان کی سطح کی بلندی میں غلط اور جامد تصورات کو حائل کر دینا۔ یہ ہے قتلِ اولاد کا وہ نیا طریقہ جو مذہب کے نام پر اختیار کیا گیا ہے اور جو "وأد" سے کہیں زیادہ سنگین جرم ہے، اس لئے کہ زندہ درگور کرنے کے بعد چند منٹ کلجھا کے ہی بالآخر موت بن کر اس کی تمام تکلیفوں کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ لیکن اسے مستقل ہستی بننے سے روک دینا اور بے بس بنا کر ہمیشہ کے لئے اپنا محتاج قیدی کر لینا اسے عمر بھر کے لئے زندہ درگور کر دیتا ہے۔ وہ نہ مر سکتی ہے نہ جی سکتی ہے۔ لا یموت فیھا ولا یحییٰ۔ خود فیصلہ کر لیجئے کہ یہ زیادہ بڑا جرم ہے یا ضبطِ تولید کا وہ طریقہ جس میں اس کے جرثومۂ زندگی کو انسانی شکل اختیار کرنے سے پہلے ہی ضائع کر دیا جائے۔